ڈاکٹر وحید قریشی

پاکستانی قومیت کی تشکیل میں اُردو کا کردار

جائزہ، مسائل اور تجاویز

(۱)

۱۴ اگست ۱۹۴۷ کو دنیا کے نقشے پر ایک ملک نمودار ہوا جو عالم اسلام میں اپنی نوعیت کا پہلا تجربہ تھا۔ یہ ایک نظریاتی ریاست تھی جس کے عوام نے اسلام کو ایک جذباتی رشتے کے طور پر قبول کیا تھا اور اسے زندگی کی اعلیٰ ترین قدر قرار دیتے ہوئے پاکستان کو "اسلام کی تجربہ گاہ" بنانے کا عہد باندھا تھا۔ پاکستان میں مذہب اسلام کو سماجی زندگی کا اہم عنصر اور باہمی ثقافتی رشتوں میں فعّال قوت کے طور پر برقرار اور بحال رکھنے کی مساعی کو جہاں اور کئی منفی اور مرکز گریز قوتوں کا مقابلہ کرنا تھا وہاں خود پاکستان میں قومیت کی تشکیل کا مسئلہ بھی گوناگوں فکری اور سیاسی افکار و خیالات کی زد میں آیا۔ مذہب کی بنیادی اہمیت کو تسلیم کرنے کے باوجود اسے زندگی کے زندہ اور حقیقی مسائل میں ایک مؤثر قوت کے طور پر استعمال کرنے میں جو کوتاہیاں ہوئیں ان کے اسباب چاہے کچھ ہی ہوں اور اس کی ذمہ داری چاہے کسی فرد واحد، کسی جماعت یا کسی مخصوص طبقے پر ہو، اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اصولی اور اساسی مباحث اور عملی زندگی کے درمیان تضادات نے جنم لیا، اس سے فکر و نظر کی دنیا بھی انتشار و ابہام سے دوچار ہوئی اور مادی زندگی کے مظاہر بھی کسی مناسب جہت سے محروم رہ گئے۔ فکری سطح پر یہ سوال اہم تھا کہ پاکستان میں قومیت کی تشکیل کن خطوط پر ہو؟ پاکستانی قومیت کے عناصرِ ترکیبی کیا ہیں؟ اس ملک میں بسنے والوں کا ماضی کیا تھا؟ جدوجہدِ آزادی میں کن داخلی اور خارجی اسباب و علل نے حصہ لیا؟ اس نظریاتی ریاست اور دوسرے دنیا میں رائج مختلف نظام ہائے فکر کے درمیان اخذ و انجذاب کے کون کون مرحلے ممکن ہیں؟

۱۹۴۷ء تک سیاسی وجود میں یہ دلیل سب سے اہم تھی کہ مسلمان من حیث القوم دوسری اقوام سے الگ ہیں۔ ان کی روحانی اور مادی قدریں اس بات کا تقاضا کرتی ہیں کہ وہ ایک ایسے خطّے کا مطالبہ کریں

جہاں رہ کر وہ اپنی قدروں کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ اس کے لیے کئی بنیادی حقائق کا ادراک ضروری تھا:

۱۔ ہندوستان ایک ملک نہیں ایک برصغیر ہے جس میں ایک قوم نہیں کئی قومیں آباد ہیں۔

۲۔ برصغیر میں مسلمان ہندوؤں کے بعد سب سے بڑی اکثریت ہیں اور جغرافیائی لحاظ سے کئی علاقوں میں انھیں دوسری اقوام پر عددی برتری حاصل ہے اس لیے ان خطوں میں جہاں وہ اکثریت میں ہیں اپنی زندگی کو اپنے نظریات کے مطابق بسر کرنے کا آئینی حق رکھتے ہیں۔

۳۔ قومیت کی بنیاد جغرافیائی حدود سے بالا ہے، مسلمان بطور مسلمان ایک وحدت ہیں اور اس حیثیت سے وہ ایک قوم ہیں۔

یہ دلیل کہ ہندوستان ایک ملک نہیں ایک برصغیر ہے، اس دلیل سے مربوط ہے کہ جب تک کسی قوم کو کسی خاص علاقے میں مؤثر عددی اکثریت حاصل نہ ہو وہ الگ ملک کا مطالبہ نہیں کر سکتی اور یہ بھی کہ مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد جغرافیائی نہیں بلکہ اسلام کے جغرافیائی حدود سے ماورا ہے:

پاک ہے گردِ وطن سے سرِ داماں تیرا
تو وہ یوسف ہے کہ ہر مصر ہے کنعاں تیرا (اقبال)

بہ الفاظِ دیگر کہ مسلمانوں کا قومی تشخص مخصوص اقدار پر منحصر ہے، جغرافیائی حدود کا پابند نہیں۔ یہ گویا مسلمانوں کی قومیت مغرب کی جغرافیائی، نسلی، لسانی، لونی، شعوبی قومیت سے بھی الگ ہے اور قومیتوں کے جدید تصور سے بھی جداگانہ حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے عناصرِ ترکیبی مادی اور جغرافیائی شکل وصورت کے باوجود ایک تعمیمی اور تنزیہی دائرۂ کار کے پابند ہیں۔

پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد قومیت کے مجرد تصورات نے تجسیمی رنگ اختیار کیا مسلمانوں نے برصغیر کی سیاسی جدوجہد میں ایک قوم کے طور پر سیاسی سرگرمی کا اظہار کیا تھا۔ نئے ملک کے وجود میں آنے سے کئی دور رس تبدیلیاں آئیں۔ پاکستان دو منطقوں پر مشتمل تھا، مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان۔ ان خطوں میں بسنے والے مسلمانوں میں "ہندی مسلمان" کی بجائے پاکستانی مسلمان کہلائے۔ ہندی مسلمان وہ تھے جو بھارت میں رہ گئے۔ گویا برصغیر کی مسلمان قوم دو حصوں میں بٹ گئی، ہندی مسلمان اور پاکستانی مسلمان۔ یہ الگ الگ ملکوں کے ایسے باشندے قرار پائے جن کی آئندہ کی جدوجہد کی راہیں بھی مختلف تھیں اور حال

کے مسائل و افکار بھی جداگانہ تھے۔ ان کے علاوہ مسلمانوں کی وہ آبادی بھی تھی جو گردشِ حالات کے تحت نقل مکانی پر مجبور ہوئی۔ پاکستان کے قدیم مسلمان باشندوں کے درمیان "مہاجرین" کی مؤثر آبادی آکر بس گئی جس سے تہذیبی اور مادی سطحوں پر بعض اثرات مرتب ہوئے۔ اب پاکستانی قومیت کو جن مسائل کا سامنا تھا، ان میں فکری سطح پر سب سے اہم یہ تھا کہ ہندی مسلمان اور پاکستانی مسلمان جداگانہ تشخص کے مظہر سمجھے جائیں اور مہاجرین اور مقامی کے مابین یگانگت اور انجذاب کا ایسا عمل بروئے کار آئے کہ پاکستانی قوم ایک وحدت میں منسلک ہو جائے اور اس کے مختلف باشندوں، مختلف مذاہب کے ماننے والوں اور مسلمان اکثریت کے درمیان بھی ایسی ہم آہنگی پیدا ہو کہ سبھی ایک پاکستانی قوم کہلا سکیں۔
یہ سوال بھی اہم تھا کہ اقلیتوں کی حیثیت پاکستان میں کیا ہے؟ کیا وہ مسلمانوں سے مذہبی اختلاف کے باوصف پاکستانی قوم کا حصہ ہیں یا ان کا مذہبی تشخص ان کی جداگانہ حیثیت کا متقاضی ہے؟ اگر غیر مسلم بھی پاکستانی قوم کا حصہ ہیں تو مذہبی بنیاد پر مسلمانوں کو ایک قوم قرار دینے کا کیا مطلب ہے؟ یہ وہ اُلجھے ہوئے سوال ہیں جن کے حل کیے بغیر پاکستانی قومیت کی تشکیل ممکن نہیں۔

(۲)

پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے۔ یہ تصور باشندگانِ پاکستان کے دلوں میں اس قدر راسخ ہے کہ آئندہ کئی برس تک بھی کوئی سیاسی جماعت اس کا اقرار کیے بغیر برسرِ اقتدار نہیں آسکتی اور ملک کی اس حیثیت کو نظر انداز کر کے کوئی خالص سیکولر نظام رائج کرنے کا دعویٰ بھی عملی صورت اختیار نہیں کر سکتا تاوقتیکہ اس کے پسِ پشت مذہبی اقدار اور روحانی واردات نہ ہوں۔ پاکستان کا سرکاری مذہب اسلام ہے۔ اس خطۂ زمین میں مسلمانوں کی اکثریت ہے جو اپنے آپ کو بطور مسلمان ایک وحدت قرار دیتے ہیں اور اس پر اصرار بھی کرتے ہیں کہ عملی زندگی میں اسلام کے اصول و قوانین کی پابندی کریں گے۔ اصول اور عمل کے درمیانی فاصلوں اور تضادات کی فراوانی کے باوجود اسلام کی روحانی اور مادی اقدار کا عقلی اور جذباتی سطحوں کا برقرار و بحال رہ جانا اس بات کا کافی ثبوت ہے کہ مسلمانوں کے ملّی عزائم میں اب بھی اسلام ایک زندہ اور فعال عنصر کے طور پر موجود ہے۔ اب سے نصف صدی قبل علامہ اقبال کے عنفوانِ شباب میں امریکی اور انگریزی قومی حس، ملکی اور جغرافیائی حدود کے حوالے سے بیدار ہوتی ہے، اس کا یہ بھی مطلب ہے کہ عام پاکستانی کی عملی زندگی سے اسلام کے خارج ہو جانے کے باوجود مذہب کی گرفت معاشرے میں

اب بھی اتنی قوی ہے کہ خفیف سے خفیف احساس تردید کے موقع پر یہ جذبہ پوری قوت کے ساتھ دوبارہ اُبھر آتا ہے اور قومی تشکیل میں اس اہم عنصر کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

(۳)

قائداعظم نے فرمایا تھا کہ مسلمان متمدن دنیا کی مقرر کردہ ہر تعریف کے مطابق ایک الگ قوم ہیں۔ مسلمانان ہند نے اپنے قومی تشخص کے لیے جو مطالبہ کیا وہ اس بنا پر نہ تھا کہ ہمیں ایک مادی حدود کا پابند ملک درکار ہے بلکہ اس بنا پر تھا کہ متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کی وحدت کو کئی خطرات کا سامنا تھا، بطور مسلمان وہ اپنی زندگیوں کو اپنے نظریات کے مطابق بسر نہیں کر سکتے تھے۔ ان نظریات پر عمل کی آزادی کے لیے انھوں نے الگ ملک کا مطالبہ کیا تھا۔ محض خطۂ ارض حاصل کرنا مقصود نہ تھا۔ بلکہ یہ خطۂ ارض اس لیے درکار تھا کہ مسلمان اپنی زندگیوں کو اسلام کے طریق حیات کے مطابق ڈھال سکیں۔ وہ ایسا کر سکے یا نہیں؟ ناکامی کے اسباب کیا تھے؟ اس کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟ وہ کون کون سے مرحلے تھے جب بآسانی ایسا کیا جا سکتا تھا اور ہم نے ان مواقع کو کیوں کھو دیا؟ مجرم سیاست دان تھے؟ سیاسی جماعتیں یا ادیب تھے یا شاعر؟ اردو کے ادیب تھے یا علاقائی زبانوں کے؟ یہ بجائے خود اہم مسائل ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ دشنام طرازی اور تشدد کا وہ سبق جو ان سوالوں کا لازمی نتیجہ ہے، اب اپنی افادیت کھو چکا ہے، ہمیں اپنی معاشرتی زندگی میں تشدد کی بجائے توازن کی اقدار پر بھروسا کر لینا چاہیے۔ اب کسی قوم کو زیادہ دیر تک منفی قدروں کے سہارے زندہ نہیں رکھا جا سکتا۔

(۴)

قیام پاکستان کے فوراً بعد محدود مدت ہی میں "مرکز گریز" رجحانات نے اپنے قدم جما لیے تھے۔ مغربی پاکستان میں یہ رجحانات لسانی مسائل سے شروع نہیں ہوئے بلکہ ان کا آغاز زندگی کے دوسرے شعبوں سے ہوا۔ بیس برس کے اندر ہی اندر صوبہ پرستی برگ و بار لانے لگی۔ پھر علاقہ پرستی اور مقامی کلچر کی حوصلہ افزائی ۱۹۵۸ء کے بعد تو اس شدت سے ہوئی کہ تین متحارب نظریات قومیت کی لہریں ایک دوسرے سے دست و گریبان ہو گئیں۔ اسلامی تصورِ قومیت کے خدوخال جنھیں نئی مملکت میں ایک مؤثر عنصر کے طور پر کام کرنا تھا، مغربی تصورِ قومیت اور علاقہ پرستی کے زیر اثر ماند پڑتے گئے۔ داخلی سیاست کے علاوہ عالمی سیاسیات کے پس منظر میں اس صورتِ حال نے پاکستانی قومیت کو تشکیل پذیر

16338

ہونے سے روکا۔ عقیدے اور عمل کے درمیان تفاوت نے زندگی کے تضاد کو اور بھی زیادہ پریشان کن بنا دیا۔ قومیت اور اسلام دونوں کا ذکر اوپرے دل سے اور محض زبانی جمع خرچ کے طور پر ہونے لگا، اس سے اقدار کی عملی صورتوں ہی کو نہیں بلکہ ان کی عظمت و حرمت کو بھی نقصان پہنچا۔ قومی شعور کے مادی مظاہر میں تین سطحیں اہمیت رکھتی ہیں، علاقائی سطح، ملکی سطح اور ملّی سطح۔ ان تینوں سطحوں میں کامل ہم آہنگی اور توازن ہی صحیح ملّی قومیت کی نشوونما کے ضامن ہو سکتے ہیں۔ قوم اور ملّت کے الفاظ قرآن پاک میں بھی آئے ہیں۔ علامہ اقبال نے مسلمانوں کے تصورِ وطنیت پر بحث کرتے ہوئے کلامِ پاک کے حوالے سے قوم اور ملت کے فرق کی وضاحت کی ہے۔

پہلا اقتباس

"جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں، قرآن حکیم میں جہاں جہاں اتباع اور شرکت کی دعوت ہے وہاں لفظ ملّت یا امت وارد ہوتا ہے، کسی خاص قوم کے اتباع یا اس کی شرکت کی دعوت نہیں۔ یہ اتباع و اطاعت کی دعوت اس لیے ہے کہ ملت نام ہے ایک دین کا، ایک شرع و منہاج کا۔ قوم چونکہ کوئی شرع و دین نہیں، اس لیے اس کی طرف دعوت اور اس سے تمسک کی ترغیب عبث تھی۔ کوئی گروہ ہو، خواہ وہ قبیلے کا ہو، نسل کا ہو، ڈاکوؤں کا ہو، تاجروں کا ہو، ایک شہر والوں کا ہو، جغرافیائی اعتبار سے ایک ملک یا وطن والوں کا ہو، وہ محض گروہ ہے رجال کا یا انسانوں کا۔ وحیِ الٰہی یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نقطۂ خیال سے ابھی وہ گروہ ہدایت یافتہ نہیں ہوتا۔ اگر وحی یا نبی اس گروہ میں آئے تو وہ اس کا پہلا مخاطب ہوتا ہے، اس لیے اس کی طرف منسوب بھی ہوتا ہے۔ مثلاً قومِ نوح، قومِ موسیٰ، قومِ لوط۔ لیکن اگر اس گروہ کا مقتدا کوئی بادشاہ یا سردار ہو، گروہ اس کی طرف بھی منسوب ہوگا، مثلاً قومِ عاد، قومِ فرعون۔ اگر ایک ملک میں دو گروہ اکٹھے ہو جائیں اور اگر وہ متضاد قسم کے رہنماؤں کے گروہ ہوں تو وہ دونوں سے منسوب ہو سکتے ہیں مثلاً جہاں قومِ موسیٰ تھی وہاں قومِ فرعون بھی تھی۔"

"ہر مقام پر جہاں قوم کہا گیا، وہاں وہ گروہ عبارت تھا جو ابھی ہدایت یافتہ اور غیر ہدایت یافتہ سب افراد پر مشتمل تھا۔ جو افراد پیغمبر کی متابعت میں آگئے توحید تسلیم کرتے گئے، وہ اس پیغمبر کی ملت میں آگئے، اس کے دین میں آگئے یا واضح تر معنوں میں مسلم ہو گئے۔ یاد رہے کہ دین اور ملت کفار کی بھی ہو سکتی ہے ..... ایک قوم کی ایک ملت یا اس کا منہاج تو ہو سکتا ہے لیکن ملت کی قوم کہیں نہیں آیا۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ خدا نے قرآن میں ایسے افراد کو جو مختلف اقوام و ملل سے نکل کر ملّتِ ابراہیمی میں داخل ہو گئے ان کو داخل ہونے

کے بعد لفظ قوم سے تعبیر نہیں کیا بلکہ امت کے لفظ سے کیا ہے۔ ان گزارشات سے میرا مقصد یہ ہے کہ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں قرآنِ کریم میں مسلمانوں کے لیے امت کے علاوہ اور کوئی لفظ نہیں آیا ..... قوم رجال کی جماعت کا نام ہے اور یہ جماعت باعتبار قبیلہ، نسل، رنگ، زبان، وطن اور اختلاف ہزار جگہ اور ہزار رنگ میں پیدا ہو سکتی ہے، لیکن ملت سب جماعتوں کو تراش کر ایک نیا اور مشترک گروہ بنائے گی۔ گویا ملت یا امت جاذب ہے اقوام کی اور خود ان میں جذب نہیں ہو سکتی۔" (حرفِ اقبال، ص ۲۵۷-۲۵۹)

دوسرا اقتباس:

"اگر قومیت کے معنی حب الوطنی یا ناموس وطن کے لیے جان قربان کرنے کے ہیں تو یہ اسلام کے خلاف نہیں۔ قومیت کا اسلام سے اس وقت تصادم ہوتا ہے جب وہ ایک سیاسی تصور بن جاتی ہے اور اتحادِ انسانی کا بنیادی اصول ہونے کا دعویٰ کرتی ہے اور یہ مطالبہ کرتی ہے کہ اسلام شخصی عقیدے کے پس منظر میں چلا جائے اور قومی زندگی میں ایک حیات بخش عنصر کی حیثیت سے باقی نہ رہے۔" (حرفِ اقبال، ص ۱۷۳)

تیسرا اقتباس:

"قومیت کا مسئلہ مسلمانوں کے لیے ان ممالک میں پیدا ہوتا ہے جہاں وہ اقلیت میں ہیں اور جہاں قومیت کے مغربی تصور کا تقاضا ہے کہ مسلمان اپنی ہستی مٹا دیں۔ جن ممالک میں مسلمان اکثریت میں ہیں، اسلام قومیت سے ہم آہنگی پیدا کر لیتا ہے کیونکہ یہاں اسلام اور قومیت عملاً ایک ہی چیز ہیں۔ جن ممالک میں مسلمان اقلیت میں ہیں، مسلمانوں کی یہ کوشش کہ ایک تہذیبی وحدت کی حیثیت سے خود مختاری حاصل کی جائے حق بجانب ہوگی۔ دونوں صورتیں اسلام کے بالکل مطابق ہیں۔" (حرفِ اقبال، ص ۱۷۳)

ان اقتباسات سے چند بنیادی نتیجے نکلتے ہیں:

۱۔ ملت کا دارومدار ایک خاص تنزیہی تصور پر ہے۔

۲۔ قومیت کے معنی حُبِ الوطنی یا ناموسِ وطن کے لیے جان قربان کرنے کے ہیں تو یہ اسلام کے خلاف نہیں۔ قومیت کا اسلام سے اس وقت تصادم ہوتا ہے جب وہ ایک سیاسی تصور بن جاتی ہے اور اتحادِ اسلامی کا بنیادی اصول ہونے کا دعویٰ کرتی ہے۔

۳۔ حُبِ الوطنی کی بنیاد ارضی رشتوں کے استحکام کی بجائے ان کی وسعت پذیری پر ہے۔ اقبال وطن کو مکان سے نکال کر زمان میں پھیلانے کے قائل تھے۔

۴۔ ان ممالک میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں اسلام اور قومیت عملاً ایک ہی چیز ہیں۔ اس لیے ایک دوسرے کے متصادم نہیں۔

ان نکاتِ چہارگانہ پر غور کیجیے تو اسلام کا تصورِ قومیت تین مدارج پر مشتمل نظر آتا ہے:

اول ان سب سے اوپر کے درجے میں مسلمانوں کا بطورِ ملّت مستحکم ہو کر اور تنزیہی عمل کے ذریعے ملّتِ واحد میں متشکل ہونا اور جو تصورات اس کے رستے میں حائل ہوں ان کی بیخ کنی کرنا۔

دوسرے درجے پر کسی خطۂ ارض میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہو حُب الوطنی کے نفسیاتی عوامل کی پرداخت کرنا۔ لیکن ان عناصر کی سرکوبی جو اتحادِ اسلامی کے بنیادی اصول کے خلاف ہوں اور مسلمانوں کو دیگر ملکوں کے مسلمانوں سے جدا کر کے نسلی یا لونی یا شعوبی یا ملکی یا علاقائی بنیادوں پر جدا کرتے ہوں۔

تیسرے درجے پر حُب الوطنی کی وہ محدود صورت آتی ہے جس میں اپنے صوبے، اپنے ضلعے یا اپنے شہر یا علاقے کی محبت شامل ہو اس محبت کو بھی مکان کی قید سے نکال کر زمان کی وسعت میں سمونے کی ضرورت ہے۔

مغربی تصورِ قومیت لسانی، لونی، شعوبی، جغرافیائی اور اقتصادی عوامل کو ملکی سطح پر محدود کرتا ہے اور وسعت پذیری کے اس عمل کی نفی کرتا ہے جو مسلمانوں کو ایک ملّتِ واحد میں منسلک کر سکے۔ اسی طرح علاقائیت کا تصور بھی علاقائی زبان، علاقائی کلچر اور علاقائی رسم و رواج کے استحکام کے ذریعے وسعت پذیری کے عمل کی نفی پر منتج ہوتا ہے اور علاقائیت کو منتہا و مقصود جان کر قومی تشخص اور اس کے آگے ملّی تشخص کے تصورات کو دھندلانے کا سبب ہو جاتا ہے۔ ابھی جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسلام مقامی عناصر کی حوصلہ شکنی کرتا ہے یا یہ کہ ملکی سطح پر استحکام کا قائل نہیں۔ ایسا ہرگز نہیں، اسلام روحانی اقدار کے ساتھ ساتھ مادی اقدار کو بھی اہمیت دیتا ہے اور مادی مسائل کے وجود سے انکار نہیں کرتا بلکہ ان سے کام لینے کا قائل ہے۔ مختلف ممالک میں اسلام کے فروغ کی تاریخ پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے جہاں وہ گئے اور جہاں بھی جا کر بس گئے، ان مقامات اور ان علاقوں کو اپنا وطن سمجھا بلکہ واپسی کے امکانات کو خارج کرنے کے لیے اپنی کشتیاں جلا دیں۔ جغرافیائی حدود کی یہ نفی مقامی عناصر کے انجذاب کا باعث ہوئی۔ انھوں نے ہر علاقے کے کلچر، ہر علاقے کی روایات، ہر علاقے کی زبان، رسم و رواج اور سماجی زندگی کے جملہ مظاہر کو اختیار کیا۔ اس طرح جس ملک میں بھی گئے اس کی تمدنی زندگی، مادی حقائق اور زبان و بیان

کی جملہ روایات کو بھی اپنا لیا۔ یہ تاریخی عمل کے صحیح ادراک پر مبنی تھا۔ مسلمانوں کا کلچر، مسلمانوں کی روایات اور مسلمانوں کی طرز زندگی کے مختلف پہلو تنوع کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔ ہر علاقے، ہر ملک اور برصغیر کے مادی وسائل و رجحانات کو اس حد تک قبول کیا گیا جس حد تک وہ اسلام کے بنیادی افکار و نظریات سے متصادم نہ تھے۔ رد و قبول کا یہ عمل اس اساسی نقطۂ نظر کے تحت ہوا کہ وہ عناصر جو اُمت کی تشکیل اور اسلام کی تاسیس کے رشتے میں حائل تھے رد کر دیے گئے، وہ تمام مقامی عناصر جو ممد و معاون ہو سکتے تھے انھیں قبول کر لیا گیا۔ یہ سماجی عمل، رسم و رواج، طرز بود و باش، ادبی روایات، فلسفیانہ افکار اور لسانی مسائل سبھی میں یکساں جاری و ساری رہا۔ یہ تنزیہی طریق کار جو مکان سے زمان کی طرف جانے کا تاریخی عمل بھی ہے، قومی تشخص کی جان ہے اور اس کا احساس کیے بغیر پاکستان میں قومیت کی تشکیل کے مسائل کو صحیح تناظر میں نہیں دیکھا جا سکتا۔

(۵)

علاقائی محبت سے ملکی محبت اور ملکی محبت سے ملی محبت تک کے تینوں دائرے اپنی اپنی حدود میں مشترک اقدار کی تلاش اور ان کی تنظیم پر منحصر ہیں، لیکن اقدار اور ان سے متعلق خواہشات وغیرہ کی درجہ بندی کا لحاظ نہ رہے تو معاشرتی انتشار اور بحران سے دامن نہیں بچایا جا سکتا۔ پاکستان میں داخلی فکری تضادات نے خارجی حقائق کے درمیان ربط و آہنگ کی عدم موجودگی کے ساتھ مل کر معاشرے کو کئی لحاظ سے منتشر اور تہذیبی اقدار کو مضمحل کر دیا ہے، اقتصادی عوامل، ملکی سطح پر نظم و ضبط اور توازن و ترتیب میں مدد دے سکتے تو ان سے پاکستانی قومیت کی تشکیل میں بڑی مدد مل سکتی تھی۔ سیاسی عدم استحکام اور دولت کی غیر مساوی تقسیم نے ایک طبقے کو امیر سے امیر تر اور دوسرے کو غریب سے غریب تر کر دیا۔ اس سے معاشرے کا داخلی آہنگ بُری طرح مجروح ہوا۔ اس کا اثر زندگی کے جملہ مظاہر پر پڑا۔ بے اطمینانی، نفرت، منافقت اور سیرت کشی اسی عدم توازن کا ایک بالواسطہ اظہار تھے۔ قومیت کی جدوجہد میں تینوں دائروں میں عدم توازن بڑھ جائے تو پاکستانی قومیت کی تشکیل و تعمیر کا عمل سُست ہو سکتا ہے اور ایسے میں علاقائی اور صوبائی عصبیتوں کو فروغ کا موقع ملے گا۔ زندگی کئی عوامل پر مشتمل ہے۔ اقتصادی، سیاسی، سماجی، ادبی دوائر میں قومیت کی مناسب نشوونما اور زندگی کے مسائل میں توازن اور توانائی کی بحالی پاکستانی مسلمانوں کی تنظیم نو میں اہم عنصر کے طور پر کام کر سکتی ہے۔ خوف، دہشت، نفرت اور حقارت چاہے خارجہ پالیسی

ہی کا حصہ ہو بہر حال منفی قدریں نہیں اور منفی قدروں کا اثر قومیت کی تشکیل میں محدود اور عارضی ہوتا ہے۔ خارجہ پالیسی کا ذکر آیا ہے تو پاک بھارت تعلقات کا مسئلہ بھی اہم ہے۔ دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات کی نوعیت پاکستانی قومیت پر اثر انداز رہی ہے۔ برصغیر کی تقسیم کے بعد سے ہندو مسلم فسادات کے زیر اثر برابر مظلوم مسلمانوں کو پاکستان میں پناہ لینی پڑی ہے۔ ملی احساسات کا تقاضا بھی یہی تھا کہ نئے آنے والوں کو تحفظ دیا جاتا۔ تہذیبی سطح پر اس کا اثر یہ ہوا کہ مہاجر آبادی کی تہذیبی اقدار میں ہر طرح نیا خون شامل ہوا۔ اسے بعض حلقوں میں ثقافتی یلغار سمجھا گیا جس سے قومی کردار کی نشو و نما کی رفتار سست ہو گئی۔ پاکستان کی آبادی کے مختلف حصوں میں ابلاغ عامہ کے ذرائع کی مدد سے باہمی اعتماد بحال کرنے کی شدید ضرورت ہے۔ آئندہ پاکستان بھارت تعلقات کی کیا صورت ہوتی ہے اور بھارت کا رویہ بھارتی مسلمانوں کے بارے میں کیا ہوتا ہے۔ اس کے بارے میں کچھ کہنا قبل از وقت ہو گا لیکن ہماری خارجہ پالیسی اور بھارت کی داخلی پالیسی میں اگر کوئی نمایاں تبدیلی آئی تو اس کا اثر پاکستان کی تہذیبی زندگی پر ضرور پڑے گا۔

مثبت قدروں کے فروغ کے علاوہ اقتصادی اور سیاسی استحکام بھی قومیت کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ حال ہی میں ان سطحوں پر کچھ تبدیلیاں آئی ہیں جن میں سے ایک کا ذکر ضروری ہے۔ زرعی مسائل کے سلسلے میں مثبت قدم اٹھایا گیا جس کا کچھ زیادہ چرچا نہیں ہوا لیکن میرا خیال ہے کہ قومیت کی تشکیل کے سلسلے میں اس انتہائی اہم قدم کی اہمیت کا احساس ضروری تھا۔ کچھ عرصے سے مختلف صوبوں میں آزادی کا رجحان بڑھ رہا تھا، زرعی پیداوار کی نقل مکانی پر پابندی بھی ایک ایسے مرحلے پر آ گئی تھی کہ مختلف صوبوں کی اکانومی آزاد بنیادوں پر پھولنے پھلنے لگی تھی۔ اگر اس عمل کو خوراک کی بین الصوبائی حمل و نقل کی پالیسی کے ذریعے بروقت نہ روکا جاتا تو مستقبل قریب میں اس سے صوبوں میں علیحدگی پسندی کے رجحانات کو تقویت ملتی اور یہ پاکستانی سالمیت کے حق میں سخت مضر ہوتا۔ پاکستان کے مختلف صوبوں کو اقتصادی لحاظ سے اگر ایک دوسرے پر منحصر کیا جا سکے تو اس سے قومی یک جہتی کو فائدہ پہنچے گا۔ اس جہت میں ابھی مزید مساعی کی ضرورت ہے۔

(۶)

ملکی سالمیت اور پاکستانی قومیت کے لیے زبان کے کردار کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، زبانوں کا مسئلہ متحدہ ہندوستان کے زمانے ہی سے ادبی اور لسانی سے زیادہ سیاسی رہا ہے۔

زبان کی حیثیت کے جائزے سے پہلے یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ تاریخ اسلام سے زبانوں کے بارے میں مسلمانوں کی روش کا کیا اندازہ ہوتا ہے مسلمانوں کے نزدیک زبان اظہار کا وسیلہ ہے۔ دنیائے اسلام کے مختلف خطوں میں مختلف زبانیں رائج ہیں۔ کلام پاک عربی زبان میں نازل ہوا۔ اس لحاظ سے مسلمانوں کی علمی اور مذہبی زندگی کے لیے اس کی اہمیت ہر زمانے اور ہر دور میں قائم رہی۔ جب ایران میں اسلام کو فروغ حاصل ہوا تو خود عربی علم و ادب میں ایرانیوں نے وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے کہ اگر آج اُن کی تحریروں کو عربی ادب سے خارج کر دیا جائے تو اس کا سب سے اہم اور قابل قدر حصہ ہماری نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ جب مسلمانوں کے قدم ہندوستان و پاکستان کی سرزمین پر آئے تو یہاں دینی علوم کی ترویج میں عربی زبان کو تفوق اور برتری حاصل رہی۔ لیکن تاریخ اسلام کی ورق گردانی سے معلوم ہوتا ہے کہ عالم اسلام میں کبھی بھی لسانی بنیادوں پر کوئی سیاسی مسئلہ نہیں اٹھا۔ ایران میں عربی کی علمی برتری کے باوجود فارسی زبان کی ترقی ہوتی رہی اور اس کے جلو میں مختلف مقامی بولیاں پنپتی رہیں لیکن زبان کی بنیاد پر عصبیت کا کوئی اظہار نہیں ملتا۔ ہندوستان میں عربی کے دوش بدوش ابتدا ہی سے فارسی دفتری سرکاری اور بول چال کی حیثیت سے رائج رہی۔ مقامی زبانیں اپنے اپنے طور پر کام کرتی رہیں۔ زبان مسلمانوں کے لیے کسی عصبیت یا محدود جغرافیائی وطنیت کا وسیلہ نہ تھی۔ ہر علاقے کے اعتبار سے زبانوں کا مسئلہ دراصل درجہ بندی کے ایک مقررہ اصول کے مطابق طے پاتا رہا۔ مذہبی لحاظ سے عربی زبان کی تعلیم اور ترقی ہمیشہ مسلمانوں کے نزدیک اہم تھی۔ اس کے بعد عالم اسلام میں علمی اور ادبی زبان کے طور پر فارسی کو اہمیت ملی۔ اس کے بعد ملک کے اعتبار سے ملکی زبان کا درجہ آتا ہے۔ جس میں کاروباری، دفتری، معاشرتی اور تعلیمی ضروریات پوری ہوتی رہیں۔ اس کے بعد علاقائی زبانوں کا سکہ چلتا تھا۔ زبانوں کی یہ درجہ بندی ہر دور میں قائم رہی ہے۔ اسلام نے مختلف ملکوں کی زبانوں کو برقرار رکھا لیکن اسے اسلامی معاشرے کے بنیادی رجحانات سے متصادم ہونے سے روکا۔

(۷)

برصغیر میں جب آزاد مسلم ریاست کا مطالبہ کیا گیا تو زبان کا مسئلہ بھی توجہ کا باعث تھا۔ اردو ہندی جھگڑے نے بیسویں صدی کے بالکل اوائل میں سیاسی اہمیت حاصل کر لی تھی۔ اردو مسلمانوں کی اور ہندی ہندوؤں کی زبان قرار دی گئی۔ اردو کا لسانی پیکر ہند آریائی تھا لیکن اس کا ذخیرۂ الفاظ کچھ اس طرح عربی

فارسی سے مربوط تھا کہ اردو کی عام فضا اسلامی رنگ لیے ہوئے تھی۔ قائداعظمؒ نے تقاریر میں اردو کی اس مذہبی اور ثقافتی حیثیت پر بہت زور دیا ہے اور اسے پاکستان کی قومی زبان قرار دیتے ہوئے اہم دلیل تسلیم کیا۔ پاکستان بننے کے بعد لسانی مسائل کچھ زیادہ اُلجھ گئے۔ اور یہ گرہ اب تک نہیں سلجھ سکی تقسیم کے عمل سے سماجی دائرۂ کار میں کچھ نئے مسائل اُبھر آئے۔ مغربی پاکستان میں صوبائی زبانیں تیزی سے ترقی کے مراحل طے کر رہی تھیں۔ مہاجر آبادی کی آمد سے سماجی اور تہذیبی میدانوں میں اردو بولنے والوں کی ایک موثر جماعت مغربی پاکستان آئی اور مختلف صوبوں میں محدود تعداد میں بس گئی۔ جغرافیائی لحاظ سے اس کا مخصوص لسانی خطہ کراچی تھا۔ اردو مغربی پاکستان کے کسی صوبے کی بول چال کی زبان نہ تھی۔ پنجاب میں اردو کی ترقی کا دائرۂ کار ایک صدی تک پھیلا ہوا تھا۔ یہاں علاقائی عصبیت کی رو بھی کمزور تھی، اس لیے تقسیم کے بعد اردو کی حمایت میں پنجاب نے زیادہ حصہ لیا تو اس سے بعض اندیشے بھی پیدا ہوئے۔ اس احساسِ عدم تحفظ کا سبب یہ تھا کہ مغربی پاکستان کے مختلف صوبے اقتصادی اور سماجی ترقی کے مختلف مراحل میں تھے اور اُن میں یکساں عوامل کی کارکردگی سے پیدا ہونے والی وحدت ابھی نہ آئی تھی اور اقتصادی طور پر پس ماندہ علاقوں کو نظر انداز ہو جانے کا احساس بھی تھا۔ اس مرحلے پر مغربی جمہوریت اور اسلام کے درمیان فکر و نظر کی ہم آہنگی کی تلاش کے علاوہ کچھ نئے افکار بھی آئے۔ علاقائی قومیت، علاقائی کلچر اور متعلقہ مسائل بھی سماجی زندگی کے زندہ حقائق تھے جن کا لسانی سطح پر حل ضروری تھا۔ کیونکہ ان مسائل کے موزوں حل کے بغیر پاکستانی قومیت اور ملّی تشخص کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

(۸)

اردو پاکستان کے کسی علاقے کی بول چال کی زبان نہ تھی۔ اردو کو حصولِ پاکستان کی جدوجہد میں قومی زبان کے طور پر اختیار کرنے کا فیصلہ ہوا تھا کیونکہ یہ اسلامی افکار و اعتقادات کی وارث قرار پائی تھی۔ پاکستان میں اردو واحد بین الصوبائی زبان تھی جس کے ذریعے مختلف صوبے باہمی اشتراک اور ہم آہنگی اختیار کر سکتے تھے۔ اردو بولنے والوں کی آبادی کا ایک اہم حصہ پاکستان میں منتقل ہو چکا تھا۔ مغربی پاکستان میں ہجرت کرنے والوں میں اقلیتی صوبوں کے مسلمان باشندے بھی تھے اور مشرقی پنجاب کے مسلمان بھی۔ تہذیبی لحاظ سے مشرقی پنجاب کی مہاجر آبادی مقامی آبادی میں جلد جذب ہو گئی۔ دوسرے علاقوں سے آنے والوں کے رسم و رواج، معاشرتی آداب اور بعض علاقائی تشخصات مقامی آبادی سے مختلف

تھے اس لیے یہاں مقامی باشندوں میں جذب ہونے کا عمل بہت سست تھا۔ اردو بول چال کا کوئی واضح حلقہ ہو سکتا تھا تو وہ کراچی اور اس کے آس پاس کا علاقہ ہے۔ موجودہ پاکستان کے مختلف صوبوں کے درمیان اشتراک اور رابطے کا وسیلہ کون سی زبان ہو؟ یہ سوال جتنا اہم ہے اتنا ہی مشکل بھی ہے اور جب تک علاقائی زبانوں اور قومی زبان کی حدود اور دائرۂ کار کا تعین نہ ہو، اس وقت تک سیاسی اور سماجی سطح پر یہ مسئلہ حل طلب رہے گا۔ اسے سلجھانے کے لیے لسانی، سماجی اور سیاسی سطح پر چھان بین کے علاوہ اس تنزیہی اصول کو بھی پیش نظر رکھنا پڑے گا جو ملی تشخص کی جان ہے اور جس کی بنیاد پر زبانوں کی درجہ بندی کا طریق کار متعین کیا گیا ہے۔ عربی، فارسی، قومی زبان اور علاقائی زبانوں کے دائرۂ عمل کو ایسے معاشرے میں متعین کرنا اشد ضروری ہو جاتا ہے جہاں انتشار و افتراق کے عناصر شدت اختیار کر کے فکری جہت کو دھندلانے کا سبب ہو رہے ہوں۔ اور سوسائٹی اپنا نصب العین تک پس پشت ڈال چکی ہو۔

(۹)

میں نے ابھی ایک سوال اٹھایا تھا کہ مختلف صوبوں کے درمیان رابطے کی زبان کون سی ہو؟ اردو زبان کو قومی زبان تسلیم کیا گیا تھا۔ جد و جہد آزادی میں اسے مسلمانانِ برصغیر کی مشترک قومی زبان قرار دیا گیا، جس میں مسلمانوں کی بہترین ملی روایات، ثقافتی تاریخ، مذہبی اور فکری رجحانات محفوظ تھے۔ پاکستان کے قیام کے بعد جہاں مسلمانانِ برصغیر کے سیاسی تصورات کو جغرافیائی شکل و صورت ملی وہاں زبان کو ملی حصار میں دیکھنے اور محفوظ کرنے کا شعور ثقافتی عوامل کا منطقی نتیجہ تھا۔ مرکز گریز رجحانات کی نشوونما نے دوسرے میدانوں کے علاوہ لسانی مسائل کو بھی علاقائی اور صوبائی حدود کے حوالے سے دیکھنا شروع کیا۔ پاکستان کی تاسیس کے کچھ ہی عرصے بعد علاقائی زبانوں کی حمایت میں آوازیں اٹھنے لگی تھیں اور مرکزی اور اساسی کلچر کی جگہ علاقائی اور مقامی کلچر پر اصرار ہونے لگا تھا۔ اردو پاکستان میں کسی صوبے کی بول چال کی زبان نہ تھی۔ اردو بولنے والی آبادی اپنے ساتھ مخصوص علاقائی تشخصات لے کر آئی تھی۔ اردو کا ماضی اپنے ساتھ لکھنؤ اور دلّی کی اعلیٰ ادبی اقدار بھی لے کر آیا تھا۔ باہمی ہم آہنگی کا عمل تیز ہوتا تو نو وارد کلچر اور مقامی کلچر کا خمیر ایک ہو جاتا، اس سے اردو زبان اور علاقائی زبانوں کے درمیان اتحاد و اشتراک کے راستے کھل سکتے تھے۔ لیکن یوں محسوس ہوتا ہے کہ مغائرت حائل رہی، یہ کہنا مشکل ہے کہ مقامی یا مہاجر میں قصور کس کا ہے۔ ایک گروہ اس کی ذمہ داری مہاجرین پر ڈالتا ہے کہ انھوں نے مقامی فضا میں گھل مل کر رہنے کی سعی نہ کی اور

اپنے الگ تشخص کو برقرار رکھنے پر اصرار کیا، حتیٰ کہ بہت کم ایسے یوپی کے مہاجر تھے جنھوں نے صوبائی زبانوں کو روزمرّہ کے روابط میں استعمال کیا ہو۔ ان کی منطق یہ ہے کہ یوپی میں مسلمان اقلیت میں تھے۔ اقلیت کی نفسیات دفاعی مورچے کی نفسیات ہوا کرتی ہے، مہاجرین یہی نفسیاتی مزاج لے کر وارد ہوئے اور اپنے آپ کو یہاں کی سوسائٹی کا حصّہ نہ بنایا اور مقامی روایات و اقدار کو نہ اپنایا۔ دوسرا گروہ اس کی ذمہ داری مقامی آبادی پر ڈالتا ہے کہ انھوں نے ملّی مفادات کو پس پشت ڈال کر علاقائی رجحانات کی ضرورت سے زیادہ حوصلہ افزائی کی اور مہاجرین کو پاکستان میں غیر ملکی اور بدیسی جانا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ کون سا طبقہ سچائی پر ہے۔ تاہم اس سے اتنا اندازہ ضرور کیا جا سکتا ہے کہ پاکستان کی قومیت کی تشکیل میں کہیں نہ کہیں رخنہ ضرور پڑا ہے۔ مہاجر اور مقامی کے علاوہ علاقائی اور صوبائی عصبیتوں نے حالات کو اور بھی پیچیدہ کر رکھا ہے۔

منیر احمد نے The civil servant in Pakistan[1] میں ایک سوال نامے کے ذریعے اعلیٰ سرکاری افسروں کے جو اعداد و شمار جمع کیے، ان میں اس سوال کے جواب میں کہ آیا سرکاری افسروں کے فرائضِ منصبی پر علاقائی میلانات اثر انداز ہوتے ہیں یا نہیں۔ جو جواب وصول ہوئے ہیں ان میں ۶۳۵ فی صد افسروں نے علاقائی جھکاؤ کا اقرار کیا۔

یہ بات اس کا اشارہ ہے کہ پاکستان کی ذہین نسل کی سوچ کن منزلوں میں داخل ہو رہی ہے۔ اس امتیاز کا الزام چاہے کسی کے سر آئے، حق یہ ہے کہ ملکی تشخص کو جغرافیہ سے الگ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ملّی تشخص مکان سے ماورا ہے لیکن کسی ایک ملک میں رہنے والوں کو ملّی تشخص کی تقی کیے بغیر جغرافیائی حد بندی کے درمیان رہ کر ہی اپنی مشترک اقدار کا سراغ لگانا پڑتا ہے۔ افراد کے علاوہ زبان بھی جغرافیائی حصار کی مقید ہے۔ اردو زبان کو پاکستان کی ملکی زبان قرار دیتے ہوئے اس بات کا احساس و ادراک بھی ناگزیر ہے کہ اردو کو صوبائی زبانوں سے ایسا رشتہ استوار کرنا چاہیے کہ مغائرت کی جگہ اتحادِ فکر عمل کی راہیں ہموار ہوں۔ دلی اور لکھنؤ اردو کے ماضی تھے۔ اردو ادب کی تاریخ میں ان ادوار کی اہمیت مسلم ہے اور جب بھی اردو ادب کی کوئی تاریخ لکھی جائے گی، دلی اور لکھنؤ کی ادبی اور لسانی کارکردگی کا ذکر

---

[1] کتاب مذکور، ص ۱۱۱، ۱۱۲

نہایت شاندار الفاظ میں ہوگا اور ہونا چاہیے۔ لیکن ہمارا ماضی ہمارا حال نہیں ہے۔ اگر اردو زبان کی طنابیں کس کر اسے زندہ حوالوں کی بجائے مردہ حوالوں کا پابند کیا گیا۔ اگر اردو کے مقامی بول چال سے قریب آنے کا فطری عمل، دلی اور لکھنؤ سے سند ڈھونڈنے کی لاطائل کوشش میں صرف ہوگیا۔ اگر اردو کو بطور زندہ زبان اپنی جڑیں پاکستان کی سرزمین میں پیوست کرنے کا موقع نہ ملا تو مستقبل کا مؤرخ ہمیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔ اردو میں قومی، بین العلاقائی اور رابطے کی زبان رہنے کی پوری صلاحیت ہے لیکن وہ اردو دلی اور لکھنؤ کی اردو نہیں ہوگی۔ پاکستان کی اردو ہوگی، وہ جسے مقامی روزمرے، مقامی محاورے، مقامی تذکیر و تانیث اور مقامی معاشرتی زندگی کا عکاس ہونا پڑے گا۔ نئی لسانی تشکیلات کا مسئلہ تنہا زبان کا مسئلہ نہیں۔ اردو زبان اور اردو کلچر، علاقائی زبانیں اور علاقائی کلچر، قومی زبان اور قومی کلچر، ملی تشخص اور ملی کلچر ـــ زبان اور کلچر کے یہ تانے بانے ہمیں ایک بار پھر تہذیبی اقدار کی طرف لے جاتے ہیں اور خیالات کی ڈوری سیاسی اور سماجی تحفظات پر آکر رک جاتی ہے۔ معاشرتی بحران لسانی اور تہذیبی دونوں سطحوں پر آنے والے طوفان کی خبر دیتا ہے۔ اب دو ٹوک فیصلہ کرنا ہوگا کہ علاقائی زبانوں کی نشوونما کا اصل میدان کون سا ہے اور قومی زبان کا دائرۂ عمل کہاں تک ہوگا؟ مکان سے زمان کا سفر قربانیاں بھی چاہے گا اور ایثار بھی۔ اب یہ ہم پر منحصر ہے کہ ہم لسانی مسائل میں افہام و تفہیم کے راستے سے وحدتِ فکری تک آتے ہیں یا کشمکش کی راہ سے۔ آخری فیصلہ نیتوں پر منحصر ہے اور نیتوں کا حال خدا بہتر جانتا ہے۔

انتخابِ حدیث

مولانا شاہ محمد جعفر پھلواروی

یہ کتاب ان احادیث کا مجموعہ ہے جو زندگی کی اعلیٰ قدروں سے تعلق رکھتی ہیں اور جن سے فقہ کی تشکیلِ جدید میں بہت مدد مل سکتی ہے۔ ہر حدیث کی الگ سرخی قائم کی گئی ہے اور اس کا سلیس ترجمہ بھی درج ہے۔ یہ مجموعہ حدیث کی چودہ کتابوں کا خلاصہ اور بے مثل انتخاب ہے۔

قیمت: ۳۵ روپے

ملنے کا پتہ: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور